# نوآبادیاتی عہد کی اردو شاعری میں مغرب مخالف فکر اور اودھ پنچ

آصف علی
لیکچرار اردو، ورچوئیل یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر فخر الحق نوری
سابق پرنسپل، اورینٹل کالج، لاہور

# ANTI WEST APPROACH IN NEO COLONIAL
## ERA URDU POETRY AND AWADH PANCH

Asif Ali
Lecturer in Urdu
Virtual University, Lahore

Muhammaf Fakhrul Haq Noori, PhD
Former Principal Oriental College, Lahore

**Abstract**

At the start of British Rule in the Sub-continent, there arose a trend in Urdu language to oppose the new masters and to challenge the introduction of western culture and norms. The weekly Oudh Punch was the vanguard of this approach. It provided with a platform to such poets and writers, both Muslims and non Muslims, to warn the danger of alien culture through their renditions. Though seemingly they are satirical but in deep they wanted reformation. This article is a study of such Urdu poetry with regard to role of Outh Punch.

**Keywords**

اودھ پنچ، اقوام مغرب، مغرب مخالف فکر، مغربی تہذیب، مغربی ثقافت، نوآبادیات، آزادیِ نسواں، تعلیمِ فرنگ، مغرب پسندی

اودھ پنچ اخبار ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین کی زیرِ ادارت لکھنو سے جاری ہوا جس میں طنزیہ و فکاہیہ شاعری اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں ملکی سیاست کو ظرافت کا رنگ دے کر شائع کیا جاتا تھا۔ اس وقت کے نامی لوگ مثلاً منشی سجاد حسین، اکبر الہٰ آبادی، مرزا محمد مرتضیٰ عرف مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، احمد علی کسمنڈوی، منشی احمد علی شوق اور سید محمد آزاد وغیرہ اودھ پنچ سے منسلک رہے۔ اودھ پنچ کے مختلف شماروں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر اس اخبار نے تین جہات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، اول مغربی تہذیب کی مخالفت، دوم کانگرس اور ہندو مسلم اتحاد کی حمایت اور سوم سرسید احمد خان اور ان کے رفقا سے فکری و نظری اختلاف، لیکن کبھی کبھی یہ تینوں جہتیں آپس میں جذب ہوتی ہوئی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں اودھ پنچ کے ایک رخ یعنی مغرب مخالف فکر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

جہاں تک مغرب مخالف فکر کا تعلق ہے تو سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مغرب سے کیا مراد ہے؟ جغرافیائی اعتبار سے دیکھا جائے تو کرۂ ارض کو ایک فرضی خط ''خطِ نصف النہار'' جسے انگریزی میں (Prime Merdian) کہتے ہیں کے ذریعے شرقاً غرباً اور ایسے ہی ایک فرضی خط ''خطِ استوا'' یعنی (Equator) کے ذریعے شمالاً جنوباً دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خطِ نصف النہار دنیا کے نقشے پر قطبِ شمالی سے قطبِ جنوبی کو ملانے والے صفر درجے طول بلد کو تصور کیا جاتا ہے۔ اس مقام یعنی خطِ نصف النہار کے مشرق میں پورا برِ اعظم ایشیا، قریباً ۹۸ فی صد برِ اعظم یورپ اور ۹۹ فی صد برِ اعظم افریقہ واقع ہیں۔ علمِ جغرافیہ کی شاخ ''نقشہ نویسی'' (Cartography) میں شمال چونکہ نقشے میں اوپر کی طرف اور جنوب نیچے کی طرف ہوتا ہے، اس لیے خطِ نصف النہار کی داہنی طرف واقع ممالک خواہ وہ ایشیائی ہوں، یورپ میں ہوں یا افریقہ میں ہوں مشرقی ممالک کہلاتے ہیں، جب کہ خطِ نصف النہار کی بائیں جانب واقع ممالک چاہے وہ یورپ اور افریقہ میں ہوں یا شمالی و جنوبی امریکہ میں، مغربی ممالک کہلاتے ہیں۔ اس تفصیل کو مدِ نظر رکھیں تو پھر یہ ہونا چاہیے کہ ایشیا کے علاوہ یورپ اور افریقہ کے بیشتر ممالک کو بھی مشرق ہی میں شامل کیا جانا چاہیے، لیکن ایسا نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مذکورہ بالا تینوں برِ اعظموں میں سے ایشیا مکمل طور پر اور یورپ و افریقہ کا بیشتر حصہ خطِ نصف النہار کے مشرق میں واقع ہے، تاہم ایشیا چونکہ افریقہ اور یورپ کے مشرق میں ہے اس لیے یورپ و افریقہ اور امریکہ و لاطینی امریکہ کو مغرب اور صرف ایشیا ہی کو مشرق تصور کیا جاتا ہے۔ اب چونکہ برِ صغیر ایشیا ہی کا حصہ ہے تو یہ بھی مشرق ہی کی ذیل میں آئے گا۔

درجِ بالا وضاحت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ برِ صغیر میں نو آبادیات کا قیام جن مغربی اقوام کے ذریعے عمل میں آیا ان کا تعلق یورپ سے تھا، اس لیے ہم مغرب سے یورپی ممالک بھی مراد لیں تو کوئی حرج نہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں مغرب سے یورپی اقوام بالعموم اور انگریز بالخصوص مراد ہیں جو تجارتی سرگرمیوں کے لیے ہندوستان میں آئے لیکن رفتہ رفتہ یہاں کے قابض و مالک بن بیٹھے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مفتوح اقوام ہمیشہ فاتح اقوام کی تہذیب و معاشرت کی تقلید پر یا تو مجبور ہوتی ہیں یا پھر حالات ایسے بنا دیے جاتے ہیں کہ انھیں مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کہتے ہیں:

> انگریز نے بِرصغیر میں وہی کچھ کیا جو فاتح کیا کرتے ہیں۔ بقولِ کارلائل ایک قوم دوسری قوم پر صرف اپنے مفادات کے حصول کی غرض سے حکومت کیا کرتی ہے۔ چنانچہ انگریز بھی اس قاعدے سے مستثنٰی نہیں تھے۔ انھوں نے جی بھر کر استحصال کیا، بے شمار دولت سمیٹی، ہندوستان کی صنعت و حرفت کو تباہ کیا، حتیٰ کہ ڈھاکے میں ململ بنانے والے بافندوں کے انگوٹھے کاٹ ڈالے۔ غرض اس خوش حال ملک کو بالکل کنگال کر دیا۔ استحصال کے بعد حکمتِ عملی کا دور شروع ہوا، لوگوں کو تعلیم دی گئی لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کی مفید تعلیم نہیں بلکہ آرٹس کی تعلیم جس سے لوگ ملازمتیں حاصل کر سکتے تھے مگر ملک اور قوم کے لیے زیادہ مفید نہیں ہو سکتے تھے۔(۱)

ہندوستان میں یہ صورتِ حال دیکھنے میں آئی کہ مغربی اقوام نے یہاں کے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھایا اور اس خطے پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ بِرصغیر کی اندرونی سیاست انتشار کا شکار تھی جس کی بنا پر یہاں کی صورتِ حال خاصی دِگرگوں تھی۔ مغربی اقوام نے اس صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے یہاں قدم جمانا شروع کر دیے اور بِرصغیر کے جنوبی ساحلوں سے اپنے تسلط کا آغاز کیا۔ ابتدا میں یہاں پرتگالی اور اس کے بعد ولندیزیوں نے ڈیرے ڈالے لیکن وہ یہاں زیادہ دیر ٹِک نہیں سکے۔ ولندیزی خاص طور پر فرانسیسیوں کا ہدف بنے کیوں کہ ولندیزیوں کی بحری قوت فرانسیسیوں کے مقابلے میں کمزور تھی، لیکن فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزی بحری قوت زیادہ فعال، اور مستحکم تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے فرانسیسیوں کو نکال باہر کیا اور خود بلا شرکتِ غیرے بِرصغیر کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے اور یہاں کی سیاسی بساط پر اپنی مرضی کے مطابق چالیں چلنے کے لیے آزاد ہو گئے۔

انگریزوں کی آمد کے ساتھ ان کی تہذیب اور طرزِ معاشرت بھی واردِ ہندوستان ہوئی۔ اس تہذیب کے عناصر میں بہت سی ایسی اقدار شامل تھیں جو مشرق خصوصاً ہندو پاک میں آج بھی معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ ہندوستان کا اثاثہ یہاں کی اخلاقی اقدار تھیں جو مغربی تہذیب سے متاثر ہوئیں۔ مثلاً ہندوستان میں خواتین خواہ ہندو ہوں یا مسلمان پردے کا باقاعدہ التزام کرتی تھیں۔ دوسری جانب قرونِ وسطیٰ میں یورپی اقوام کی خواتین بھی پردے کا باقاعدہ التزام کرتی تھیں جو رفتہ رفتہ کم ہو کر موجودہ سطح تک آن پہنچا جسے وہاں شخصی آزادی

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لندن کے نواح میں اب بھی ایسی آبادیاں موجود ہیں جو ازمنۂ قدیم کی طرح اس روایت کی مقلد ہیں، انھیں عرفِ عام میں قدامت پسند (conservatives) کہا جاتا ہے۔اسی طرح برِصغیر اور یورپی مما لک کی تعلیم اور فنونِ لطیفہ میں بھی نمایاں فرق تھا۔ پھر مغربی اقوام کا سیاسی شعور بھی ایک اہم عنصر تھا جس نے یہاں کے لوگوں کو خاص طور پر متاثر کیا اور ان کی منصوبہ بندی نے ہندو اور مسلم اقوام جو صدیوں سے ایک ساتھ رہتی تھیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتی تھیں، کو بالکل اجنبی بنا دیا۔ یہ دونوں اقوام ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے بعد کبھی یکجا نہیں ہوئیں۔اس کے بعد ہندوؤں نے مظلوم بن کر انگریز سرکار کی نمک خواری شروع کر دی اور غدر کا سارا الزام مسلمانوں کے سر تھونپ دینے میں کردار ادا کیا اور انگریز بہادر کو یہ باور کرایا کہ انھوں نے چونکہ مسلمانوں سے حکومت چھینی ہے لہٰذا سارے فساد کی جڑ مسلمان ہی ہیں اور مسلمان ہی انگریزوں سے عناد رکھتے ہیں۔ایسے میں ایک شخص جسے دنیا سر سید احمد خان کے نام سے جانتی ہے، نے مصلح کے طور پر کام شروع کیا اور ''رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر انگریزوں کے ظالمانہ رویے کو تبدیل کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کو یہ جتایا کہ غدر میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی برابر کے شریک تھے؛ اور یہ کہ حالات اس نہج پر جا پہنچے کہ کسی نہ کسی جگہ سے یہ ردِ عمل ظاہر ہونا ہی تھا؛ اور یہ کہ انگریزوں کا اپنا رویہ بھی مسلمانوں سے مناسب نہ تھا جس نے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بھی انگریزوں سے نفرت کریں۔ سر سید اپنی اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب رہے۔ دوسری طرف انھوں نے مسلمانوں کو جدید علوم کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی اور انگریزی تعلیم کے حصول پر بھی زور دیا۔ بنیادی طور پر یہی وہ محرکات تھے جو اودھ پنچ کی اشاعت کا باعث بنے۔

اودھ پنچ اخبار نے فکری اور نظری ہر دو حوالوں سے سر سید سے اختلاف کیا اور مغربی تہذیب کی بھی مخالفت کی۔اس ضمن میں جو شاعر یا ادیب اودھ پنچ کے ہم خیال تھے انھوں نے اس میں بڑے زور وشور سے حصہ لیا۔ان میں سب سے نمایاں نام اکبرالہٰ آبادی کا ہے۔سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی کا تعلق یو۔پی کے شہر الہٰ آباد سے تھا۔ پیشے کے لحاظ سے جج تھے اور شاعری میں وحید الہٰ آبادی سے تلمذ تھا۔ اردو شاعری میں طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز اکبر ہی سے ہوتا ہے، اس سے پہلے ہمیں میر جعفر زٹلی، چرکیں اور رنگین کے ہاں مزاح کی کوششیں نظر آتی ہیں لیکن جعفر زٹلی نے فارسی میں اردو مغلظات داخل کر کے اسے حدِ ابتذال سے بھی کہیں آگے پہنچا دیا۔ چرکیں نے شاعری تو اردو ہی میں کی لیکن اس کے ہاں بھی کم و بیش وہی انداز پایا جاتا ہے جو ہم جعفر زٹلی کے ہاں دیکھتے ہیں۔تاہم رنگین نے ان مضامین کو ریختی کے ذریعے بیان کیا ہے جس میں جعفر زٹلی یا چرکیں جیسا کھلم کھلا ابتذال تو نہیں لیکن کیفیات کم و بیش وہی ہیں۔اودھ پنچ میں سیاسی منظر نامے کو طنز و ظرافت کے غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا تھا۔اکبرالہٰ آبادی کے علاوہ اودھ پنچ میں لکھنے والے شعرا میں

تربھون ناتھ ہجر، مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق وغیرہ وہ لوگ ہیں جن کا کلام اودھ پنچ میں باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا، تاہم اس کے علاوہ بھی کئی شعرا تھے جو اودھ پنچ کو قلمی تعاون بہم پہنچاتے تھے۔ اودھ پنچ کے شعرا میں ہم سب سے پہلے اکبرالٰہ آبادی کی بات کرتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکبر نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو باقاعدہ فن کے طور پر اختیار کیا۔ اودھ پنچ میں ان کی شاعری میں خاص طور پر مغرب اور مغربی تہذیب کی مخالفت نظر آتی ہے۔ مثلاً اُن کا مشہورِ زمانہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر(۲)

نوآبادیاتی عہد کے شعرا نے جن عناصر کو مغرب خیال کیا ان میں تعلیم، تہذیب، لباس، افکار، سیاسی وسماجی حالات اور معاشرت وغیرہ شامل ہیں۔ یہی وہ عناصر ہیں جنھوں نے برِصغیر کی مقامی تہذیب اور مغربی اقوام کی رواج پا جانے والی تہذیب میں فرق واضح کیا۔ اسی فرق واختلاف نے مقامی لوگوں کو مغربی تہذیب ومعاشرت سے بیزاری کی جانب مائل کیا۔ اس زمانے میں لوگوں کے اجتماعات کی ایک صورت مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعرے تھے جہاں انھیں مختلف علاقوں کے لوگوں سے میل جول اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح یہ مشاعرے افکار وخیالات کے تبادلے کا اہم ترین ذریعہ بنے۔ سیاسی وسماجی حوالے سے مغرب مخالفت کا رنگ دیکھیے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ اودھ پنچ میں لکھنے والے شعرا نے ان لوگوں کو خاص طور پر لتاڑا ہے جن کا اوڑھنا بچھونا مغربی طرز کا فیشن تھا، اس حوالے سے اودھ پنچ کے شمارہ مطبوعہ ۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء میں شامل محمود گیلانی کوٹلوی کی رباعیات ملاحظہ کیجیے ''تہذیبِ نو کی کرشمہ سازیاں'' کے عنوان کے تحت اس شمارے میں اُن کی چھے رباعیاں شامل ہیں۔ ان میں سے تین رباعیاں ایسی ہیں جن میں انھوں نے خاص طور پر جدید فیشن کو موضوعِ سخن بنایا ہے، ملاحظہ کیجیے:

پردے کو ہٹا کے آج عصمت کی کلی
چہرے پہ گلٹ کر کے وہ لیڈی نکلی
کہتی ہے کہ پردہ تھا سلف کی بدعت
اس رسم کو پر میں ہوں گنوانے والی

گردن میں جو کالر بھی ہے اور ٹائی بھی
فیشن بھی ہے تھوری سی زیبائی بھی
ہوں عصرِ جدید کی میں بیگم لاریب
پاپوش میری جو ہو رسوائی بھی

ہاں چاہیے پیارے مجھے اک سوٹ نیا
اور پاؤں میں ڈاسن کا بھی اک بوٹ نیا
آغوش میں غیروں کی نہ جاؤں گی کبھی
سکھلا دو اگر مجھ کو بھی اک جھوٹ نیا(۳)

ان رباعیات کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب سے متاثر ہونے والوں کی عام طرزِ فکر یہی تھی کہ وہ مذہب اور پردے کو بزرگوں کی طرف سے لگائی گئی بے جا پابندی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ خاص طور پر خواتین مغربی فیشن سے زیادہ متاثر ہوئیں کیوں کہ اس سے ایک طرف انھیں نت نئے مغربی ملبوسات میں کشش نظر آئی تو دوسری طرف انھیں امورِ خانہ داری سے فراغت کے لیے بہترین مشغلہ ہاتھ آیا۔ تیسری رباعی دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں مغربی فیشن پرستی کا چلن عام ہوا وہیں بے راہروی کا در بھی وا ہوا، اگرچہ اس کی شرح نہایت کم تھی، تاہم اشرافیہ میں یہ چلن عمومی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

اودھ پنچ کے تناظر میں دیکھیے تو مغربی تہذیب کے جو عناصر یا اجزاے ترکیبی ہمیں نظر آتے ہیں ان میں فیشن، مغربی طرزِ تعلیم، عورتوں کی تعلیم، سیاست وحکومت وغیرہ نمایاں ہیں۔ ۱۸ نومبر ۱۹۲۹ء کو شائع ہونے والے اودھ پنچ میں ''وائسرائے کا اعلان'' کے تحت اُنیس (۱۹) رباعیات اور ایک قطعہ شائع ہوا۔ اودھ پنچ میں ان کے خالق کا قلمی نام ''ندیم'' درج ہے۔ ان رباعیات میں انگریز حکمرانوں پر طنز اور کانگریس کی حمایت نظر آتی ہے۔ ۱۹۲۹ء کے اواخر میں پہلی گول میز کانفرنس کے لیے برطانوی حکومت نے برِصغیر کے رہنماؤں کو بھی مدعو کیا، کانگریسی رہنماؤں نے پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت نہیں کی جس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس نے حکومت کے سامنے کچھ مطالبات رکھے تھے جن کی منظوری کے بغیر انھوں نے کانفرنس میں شمولیت سے انکار کیا، اودھ پنچ کا جھکاؤ چونکہ کانگریس کی جانب تھا لہٰذا کانفرنس کی خبروں پر اودھ پنچ میں اس پر ردِعمل یوں سامنے آیا:

سنتے ہیں بڑے لاٹ کی اسپیچ ہے گول
کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ سمجھو انمول
کالونی کی ہم سری کا دعویٰ منظور
برٹش کی پالسی کا کہیے اسے گول
برکن ہیڈ بولتے نہیں میٹھے بول
ریڈنگ ادھیڑتے ہیں اسپیچ کا جھول
اب رہ گئی پاس فیلڈ پر مور کی بات
ان دونوں نے کھول دی ہے اعلان کی پول(۴)

اودھ پنچ میں لکھنے والے ادیبوں کی تحریروں میں جہاں کہیں انگریزی الفاظ ملتے ہیں عموماً انھیں طنزیہ انداز میں استعمال کیا گیا ہے تاہم کئی جگھوں پر ان سے مزاح کا کام بھی لیا گیا ہے۔اس کی مثال میں ۲۶ اگست ۱۹۲۹ء کے مطبوعہ اودھ پنچ میں شائع ہونے والی ایک نظم ''الحقا شیات'' پیش کی جاسکتی ہے جس میں انگریزی الفاظ کو ہلکے پھلکے طنزیہ انداز میں استعمال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی آزادیِ نسواں کے حوالے سے بھی چوٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مثال کے طور پر اس میں سے چند اشعار دیکھیے :

ڈانس میں جانا ہے مجھ کو اور لکچر ہال میں
بولی بیٹی باپ سے، لادیجیے سیکل مجھے
پیٹ کر سر یہ عدو کہتا ہے اب میں کیا کروں
خط میں ہے اس نے لکھا مائی ڈیئر انِکل مجھے
شیوہ ہائے مختلف کا اس کے منت کش ہوں میں
فارگیو اینڈ فارگٹ پر کر دیا عامل مجھے(۵)

اودھ پنچ کے پہلے دور میں جن حضرات نے قلمی تعاون پیش کیا ان میں بہت سے لوگ وہ تھے جو بجائے خود درجۂ استاد تک پہنچے ہوئے تھے اور ان کے ہاں مزاح کا ہر رنگ اور آہنگ دیکھنے کو ملتا ہے، تاہم دوسرے دور میں اس کا رنگ قدرے پھیکا نظر آتا ہے اور کئی ایک لوگوں نے مزاح کے نام پر ابتذال کو اپنا لیا، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انگریز قوم نے یہاں اپنے پنجے گاڑ لیے تھے اور مقامی لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ قابلِ تعریف ہرگز نہ تھا جس کی بنا پر یہاں کے لوگوں نے ان کو طنز وتعریض کی شکل میں برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہیں کہیں یہ طنز وتعریض ابتذال کی شکل اختیار کر گیا۔دوسری جانب یہاں کے مقامی افراد مغربی تہذیب سے متاثر ہوئے۔ایسی ہی ایک مثال ذیل کے اشعار میں دیکھیے :

بوسہ بازی کا کھیل کر میچ
تہذیب کا نام خوب اچھالا
ترکہ عشرت میں گر اُڑاؤ
پیرس بخشے گا حق تعالیٰ(۶)

اودھ پنچ میں فیشن اور آزادیِ نسواں کی شدت سے مخالفت کی گئی۔ ۵ اگست ۱۹۲۹ء کو طبع ہونے والے اودھ پنچ میں بی۔اے مجذوب کے قلمی نام سے لکھنے والے ایک شاعر کی ایک نظم جس میں تین قطعات بھی شامل ہیں اشاعت پذیر ہوئے جن کا مرکزی نقطہ فیشن کی مخالفت اور بے پردگی کی مذمت تھا۔ پردہ کی حمایت اور فیشن کی مذمت میں ان کا کہنا ہے:

اگر پردہ دروں کی راے تم نے بی بیو مانی
جب ہی کہنا جو عزت پر نہ پڑ جائے گھڑوں پانی
کوئی تھی آسیہ پردے میں کوئی مریمِ ثانی
بنے گی اب کوئی شیطان کی خالہ، کوئی نانی

جسے دیکھو وہی کوشش میں ہے پردہ اٹھانے کی
اسی پر اِن دنوں سب صَرف ہے زورِ مسلمانی
جوازِ بے حجابی کی ہے دُھن ورنہ اجی توبہ
کہاں مسٹر، کہاں دینی کتب کی صفحہ گردانی
بس اب تو عورتیں ہی مردِ میدانِ ترقی ہیں
کریں اب مرد گھر میں بیٹھ کر گہوارہ جنبانی
اٹھا پردہ، ہوئے آزاد بن ٹھن کر حسیں نکلے
یہ فتنے کیوں نہوں ظاہر قیامت بھی تو ہے آنی (۷)

مذکورہ بالا اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں خواتین کو مخاطب کر کے فیشن کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا گیا ہے، تاہم اس نظم میں فیشن اور آزادیِ نسواں کی مذمت کے علاوہ مذہبی اور اخلاقی اقدار کے انحطاط کی جانب بھی اشارے ملتے ہیں۔ اس نظم میں مزاح سے زیادہ طنزیہ انداز اپنایا گیا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مغرب کی پیروی، مذہب اور اخلاقیات کا جنازہ نکال کر رکھ دے گی۔ مردوں کو مخاطب کر کے یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فیشن اور آزادہ روی کی چکا چوند میں اپنی آنکھیں خیرہ کرنے کی بجائے اس کے تدارک کا سامان کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ مغربی تعلیم یا انگریزی تعلیم کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ اس نظم کے پچپن اشعار ہیں جن میں مغرب اور مغربی تہذیب کی مخالفت کا پہلو کسی نہ کسی زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مغربی تہذیب کے اثرات میں فیشن ایک اہم جز تھا جس نے مقامی لوگوں اور خاص طور پر خواتین کو متاثر کیا۔ آج ہم نت نئے فیشن کی گرم بازاری دیکھتے ہیں اس کی ابتدا آج سے ڈیڑھ سو برس سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ اگرچہ مغل حکمرانوں کی بیگمات کے ہاں نت نئے اور جدید فیشن کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں تاہم یہ سلسلہ صرف خواص تک محدود تھا، عوام کی نہ تو اتنی حیثیت تھی اور نہ ہی طاقت کہ وہ حکمرانوں جیسے فیشن کے متحمل ہو سکیں کیوں کہ مغل بادشاہوں اور امرائے دربار کی بیگمات کستوری،

خالص عرقِ گلاب، جواہرات اور سونے چاندی کو استعمال میں لاتی تھی جب کہ عام آدمی ان اشیا کا شاید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔اس کے برعکس مغربی اقوام مصنوعی اشیا تیار کر چکی تھیں جن پر لاگت کم اور چکا چوند خالص اور مہنگی اشیا جتنی بلکہ ان سے بھی کچھ سوا ہوتی تھی۔اس بنا پر مغربی فیشن کے لوازمات خواہ وہ ملبوسات ہوں یا دیگر اشیا عورتوں کے علاوہ مردوں میں بھی مقبول ہو رہے تھے۔تاہم یہی قبولِ عام اپنی روایات سے ہٹ کر مغربی اثرات قبول کر رہا تھا جو رفتہ رفتہ سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی کا باعث بھی بن سکتا تھا۔اسی خدشے کو شعرا نے اپنے کلام میں پیش کر کے عوام الناس کو مغربی فیشن پرستی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔فیشن کا تعلق چونکہ کسی حد تک تعلیم سے بھی جوڑا جا سکتا ہے اس لیے اس عہد کے شعرا نے مغربی فیشن اور جدید تعلیم کو ایک ہی زاویۂ نظر سے دیکھا۔سرسید احمد خان چونکہ جدید تعلیم کے حامی تھے لہٰذا ان کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا اور ان کو نیچری یا پیرِ نیچر جیسے ناموں سے پکارا گیا۔اسی سلسلے میں اصغر شاہ پوری نے ایک نظم بہ عنوان ''نیچری فیشن'' جو اودھ پنچ مطبوعہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی،اس میں وہ لکھتے ہیں:

گر نہیں نکٹائی تو رومال کا پھندا سہی
وارنش کا گر نہ ہو تو بوٹ سادہ چاہیے
مل نہیں سکتا اگر پتلون تو کیا ہے ضرور
پائجامہ ہی میں بس شاہکار بننا چاہیے
عورتوں کو اپنا شوہر جاننا ہے عین فرض
اپنے بچوں ہی کو کہنا اپنا بابا چاہیے(۸)

اودھ پنچ مطبوعہ ۷ جنوری ۱۹۲۹ء میں ندیم کے قلمی نام سے لکھنے والے ایک شاعر کی کچھ رباعیاں شائع ہوئیں،ان میں سے ایک رباعی بہ عنوان (اختلافِ آرا) میں پنڈت موتی لعل اور جواہر لعل نہرو کا آپس میں اختلافِ رائے،مغربی تعلیم کی کارستانی قرار دیا گیا۔اس ضمن میں شاعر لکھتے ہیں:

باپ اور بیٹے میں اختلافِ آرا
تعلیمِ فرنگ تو نے ہم کو مارا

کیوں دیکھ نہ تو چھوٹے بڑے نہرو کو
ہے نارمل اک تو اک ہے چڑھا پارا(۹)

انگریزوں نے برِصغیر میں مغربی تعلیمی نظام کا آغاز خاص سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا تھا،جس کا مقصد اپنی ضروریات کو پورا کرنا اور اپنے مقاصد (بطورِ خاص سیاسی مقاصد) کا حصول تھا۔انگریز نے برِصغیر کے تعلیمی نظام کو اس انداز سے بدلا جو ان کے لیے فائدہ مند تھا۔اس ضمن میں لارڈ میکالے کے نظریۂ

تعلیم سے ہم سب واقف ہیں۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں ایک تعلیمی آرڈیننس منظور کروایا جس کی ظاہری صورت تو یہ تھی کہ ہندوستان میں جدید تعلیم کے لیے ادارے قائم کیے جائیں اور یہاں کے لوگوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کیا جاے، لیکن درحقیقت جدید تعلیم کے لبادے میں ذہنی اور فکری غلامی کی راہ ہموار کی گئی۔ اس آرڈیننس کے حوالے سے لارڈ میکالے کا وہ قول بہت معروف ہوا جس میں اس نے کہا تھا کہ 'انگریزی تعلیم کے ذریعے ہم یہاں ایسی نسل پیدا کریں گے جس کا رنگ تو کالا ہوگا لیکن وہ دل سے انگریز ہوں گے، انگریز اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے اور اس ذہنی غلامی کے زیرِ اثر صاحبِ ثروت لوگوں نے اپنی اولاد کو ولایت پڑھنے کے لیے بھیجا۔ یہاں کے مدارس کو فرسودہ اور کم تر قرار دیا گیا اور یوں اس ملک میں ایک نیا نظامِ تعلیم رائج کر دیا جس کا مقصد حکومت کے انتظامی معاملات میں مدد کے لیے ملازمین تیار کرنا تھا تا کہ اپنی مرضی کے مطابق کام لیا جا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں پر آکسفورڈ اور کیمبرج جیسے اعلیٰ تعلیمی و تحقیقی اداروں کی بجاے ایسے ادارے قائم کیے گئے جن سے انھیں اور حکومت کو فائدہ ہو۔ اس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

> میرا خیال ہے کہ اکبر پہلے شخص ہیں جن کو بدلتے ہوئے زمانے، اس زمانے میں اپنی تہذیبی وقار کے لیے خطرہ اور انگریزی تعلیم و ترقی کو انگریزی سامراج کے قوت مند ہتھیار ہونے کا احساس شدت سے تھا اور انھوں نے اس کے مضمرات کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ (۱۰)

اس عہد میں مغربی تعلیم کا مطلب یہ تھا کہ نوجوان نسل مذہب، اخلاقیات، تہذیبی و معاشرتی اقدار اور آبا و اجداد کے طریق سے یکسر منحرف ہو کر بے راہروی اور فکری انحطاط کا شکار ہو جائے گی۔ بعد میں آنے والے زمانوں میں یہ بات ثابت بھی ہوئی کہ واقعتاً مغربی تعلیم نے ہمیں ایک طرف تو کثیر تعداد میں تعلیم یافتہ لوگ عطا کیے لیکن دوسری طرف ہم اس بات کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہیں کہ اس نظامِ تعلیم نے ہماری نسلوں کو بگاڑا ہے۔ اس ضمن میں اودھ پنچ مطبوعہ ۱۸ اگست ۱۹۲۸ء میں ایک نظم ملتی ہے جس کا باقاعدہ عنوان نہیں ہے تاہم اس کو ''ہرولۂ قلم'' کی ذیل میں لکھا گیا گیا ہے اور آخر میں راقم کے نام کی جگہ ''غلط العام'' تحریر ہے۔ اس نظم میں مغربی تعلیم کی وجہ سے جو عادات و اطوار کسی شخص میں پیدا ہونے کے امکانات ہو سکتے تھے ان میں کینہ پروری، نفاق، حسد، اخلاقی پستی اور بے راہروجیسی عاداتِ بد شامل ہیں۔ ان خصوصیات کو شاعر نے مذکورہ نظم میں یوں بیان کیا ہے:

چانسلر جامعۂ واہیہ کے اشتر قد
پا چکے ہیں جو بصیر العلمائی کی سند
جائیں وہ اونٹ کے بچے عربک کالج میں
اشترِ جنگِ جمل جن کے ہیں جدِ امجد

اونٹیالوجی کی تعلیم کے دلدادہ ہوں
بد گہر ہوں کہ نہوں، نیک ہوں وہ چاہے بد
ایسے بچوں کے لیے قید لیاقت کی نہیں
ان کو دی جائے گی فوراً ہی فضیلت کی سند
فائدہ جب ہے کہ جب قوم لڑے آپس میں
ہر اک اسکیم میں ہے آپ کا اتنا مقصد (۱۱)

جہاں تک برِصغیر کی سیاست کا تعلق ہے تو اودھ پنچ نے مقامی رؤسا کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے ان کے طریقِ زندگی پر بھی چوٹ کی ہے۔ اس کیفیت کو فریدون مرزا مجروحؔ نے اودھ پنچ میں طبع ہونے والی اپنی ایک نظم بہ عنوان ''زخم ہائے تازہ و پارینہ'' میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں یہ خوبی ہے کہ وہ اشعار جو کسی ایک موضوع سے متعلق ہیں، انھیں الگ عنوان کے تحت تحریر کیا ہے نیز یہ کہ یہ نظم غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور غزل ہی کی طرح اس میں قافیہ ورد یف کی پابندی بھی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مذکورہ نظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے، جن میں مقامی رؤسا کے چال چلن اور ان کی مغرب پسندی پر طنز کیا گیا ہے؛ دوسری طرف فیشن اور سائنسی انقلاب کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے؛ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی طرف سے بھیجے گئے کمیشنوں کو بھی مخالفانہ نظر سے دیکھا گیا ہے، اس ضمن میں اشعار ملاحظہ کیجیے:

رئیسوں کا حال

مفت کا پیسہ رعایا سے جو اپنی پائے ہے
ہوٹلوں کی جا کے لندن کی ہوائیں کھائے ہے

سائنس کا انقلاب

سرجری کی یہ کرشمہ سازیاں ہیں آج کل
نر سے مادہ بنتا ہے، مادہ سے نر بن جائے ہے

نیم ٹر صاحب لوگ

میرا صاحب اپنی پیاری میم صاحب کے لیے
پولکا باڈی شلوکے کی جگہ سلوائے ہے
رنگ پر آ ہی گیا رنگِ زمانہ دیکھ کر
اب تو کھانا بھی وہ کانٹے اور چھری سے کھائے ہے

تقلیدِ فیشن

ایسے پردے کے تصدق کیوں نہوں سب پردہ دار
ہے وہ پردہ آج کل پڑتے ہی جو اُٹھ جاے ہے

الکٹری والمُنڈ ی

عاشقو دیکھو یہ کیسے خوش وضع معشوق ہیں
کوئی سر منڈواے ہے پٹے کوئی کٹواے ہے(۱۲)

فیشن ہی کی ذیل میں ایک طنزیہ غزل ۴ تا ۱۱ فروری ۱۹۲۸ء کے اودھ پنچ میں شائع ہوئی۔اس غزل میں جدید فیشن کو ہدفِ تنقید بنایا گیا۔اس غزل میں مبتذل زبان دیکھنے کو ملتی ہے۔جس میں ادبیت سے زیادہ سوقیانہ پن نمایاں ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

داڑھی مونچھوں کی صفائی سے ہوا یہ انقلاب
نر ہوں باطن میں پہ عالم کہتا ہے مادا مجھے
عورتیں پٹے کتروانے سے جب ہو جائیں مرد
مونچھیں منڈوانے سے پھر کیوں کہتے ہو خنثٰی مجھے(۱۳)

اسی غزل میں انگریزی زبان اور مغربی رہن سہن پر لطیف طنز،تعریض کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔شاعر نے انگریزی زبان اور طرزِ بود و باش کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

اردو اور انگلش کی آمیزش سے کرتا ہوں کلام
پھر بھی کہتے ہو زباندانی سے بے بہرا مجھے
ہے تمنا ے دلی بچے بھی جتنے ہوں مرے
میری وائف کو تو ماما اور کہیں پاپا مجھے(۱۴)

ناصح کو شاید اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ جس شے کو وہ طنزاً خود سے منسوب کر رہے ہیں،مستقبل میں یہ چلن عوام و خواص میں نہ صرف یہ کہ رائج ہو جائے گا بلکہ اس کو مہذب اور پڑھا لکھا ہونے کی دلیل بھی سمجھا جائے گا۔مذکورہ غزل میں مغربی تہذیب کے اہم عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے ان پر چوٹ کی گئی ہے۔جن میں مرد و عورت کی آزادی اور مذہب سے دوری بھی شامل ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ۱۹۲۸ء میں سر جان سائمن نے برطانوی حکومت کی ہدایت پر ہندوستان کا دورہ کیا۔اس کمیشن کا مقصد ہندوستان میں برطانوی اصلاحات کا جائزہ لینا تھا،تاہم ہندوستانیوں کو اس کی آمد پر تحفظات تھے،یہی وجہ تھی کہ اودھ پنچ میں اس پر کھل کر تنقید و طنز کے تیر چلائے گئے،اس ضمن میں یہ

شعر ملاحظہ کیجیے:

خُلّت میں انہماک ہے اس درجہ کیوں تجھے؟
کیا سائنس ہی روزِ جزا کا شفیع ہے؟(۱۵)

دوسری جانب جدید تعلیم کے زیرِ اثر خواتین میں آزادہ روی بڑھ رہی تھی، اس حوالے سے اکبر الہٰ آبادی جیسے شاعر نے خواتین کی تعلیم پر سوالیہ نشان لگایا۔ اکبر خواتین کی تعلیم کی مخالفت اس لیے نہیں کرتے تھے کہ وہ طبقۂ نسواں کو تعلیم سے محروم رکھنا چاہتے تھے، بلکہ وہ جدت پسندی، فیشن پرستی اور جدید تعلیم کے نام پر خواتین کی آزادی کے مخالف تھے۔ اکبر الہٰ آبادی کو اس ضمن میں اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے روشن خیالی کے پردے میں لپٹی ہوئی بے راہروی کو سب سے پہلے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس پر حرفِ تنقید بھی اٹھایا۔ مغربی تعلیم کے بارے میں میر مضحک کے قلمی نام سے اکبر کی ایک رباعی اودھ پنچ مطبوعہ یکم نومبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی، اس میں ان کا یہ کہنا تھا:

آے ہیں ولایت آپ پڑھنے کے لیے
یا عشقِ بتاں میں سب سے بڑھنے کے لیے
جلدی سے کرو پاس کا زینہ حاصل
گر بامِ ترقی پہ ہو چڑھنے کے لیے(۱۶)

اکبر کا مطمحِ نظر اس حوالے سے مخالفانہ یا معاندانہ نہیں تھا، اصل وجہ یقیناً یہ تھی کہ مسلمان صرف مغرب کی اندھی تقلید نہ کریں بلکہ تحقیق و جستجو سے بھی کام لیں۔ اسی طرح جب وہ مغربی ایجادات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ان کی بھی مخالفت برائے مخالفت نہیں کرتے بلکہ اس کے پیچھے بھی یہی محرک کارفرما ہے کہ مسلمان ان ایجادات کے لیے مغربی اقوام کے دست نگر ہو کر نہ رہ جائیں۔ مغربی ایجادات و آلات کی مخالفت کے پردے میں مقامی لوگوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو اس بات کی جانب مائل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اہلِ مغرب کی ایجادات پر انحصار نہ کریں بلکہ خود ان علوم سے استفادہ کریں اور نئی ایجادات میں حصہ بھی لیں۔ اس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے:

> ایسے شخص کے بارے میں یہ سمجھنا زیادتی اور ناانصافی کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ترقی کا مخالف تھا، رجعت پسند تھا اور دیدۂ حق آگاہ سے محروم تھا، اور اسے بدلتے ہوئے زمانے کی خبر تھی تو بس اتنی کہ وہ اس کے خلاف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر تعلیم کی ترقی، سائنس اور صنعت کے مخالف نہیں تھے۔ وہ اس بات کے مخالف تھے کہ یہ چیزیں نوآبادیاتی نظام کے استحکام کے لیے استعمال ہو رہی ہیں یا نوآبادیاتی نظام کی علامتیں ہیں۔(۱۷)

مغربی تہذیب جس طرح اہلِ ہند کے رسوم ورواج اور طرزِ بودوباش پر اثر انداز ہو رہی تھی اس کے اثرات روز بہ روز ظاہر ہو رہے تھے اور دور بین نگاہیں ان اثرات کو نہ صرف محسوس کر رہی تھیں بلکہ حتی الوسع اس کا اظہار بھی کر رہی تھیں، اس صورتِ حال کا نقشہ اصغر ژاہ پوری اپنی نظم بہ عنوان ''حدِ تہذیب'' مطبوعہ اودھ پنچ میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

عجیب طرح کی پیدا ہوئی ہے اب یہ جھول
بڑے بزرگوں سے کرتے ہیں دل لگی کہ ٹھٹھول
سمجھتے دادا میاں کو ہیں اپنے وہ اخفش
چچا کو الو بتاتے ہیں باپ کو بغلول
نیا زمانہ، نئی روشنی کی ہے تہذیب
پرانی باتوں پہ اب بھیجتے ہیں وہ لاحول(۱۸)

ان اشعار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مغربی تہذیب میں جس قدر مادر پدر آزادی ہے اس کے اثرات ہمارے ہاں کس طرح نمایاں ہو رہے تھے یا پھر اس بات کو اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے وہ یوں کہ نوآبادیاتی عہد کے دور بین شعرا نے شاید یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اگر مغربی تہذیب اور مغربی افکار کے پھیلاؤ کو نہ روکا گیا تو ہماری آئندہ نسلیں نہ صرف یہ کہ اپنی عظیم روایات سے کنارہ کش ہو جائیں گی بلکہ مغربی افکار کی زد میں آ کر اپنے بزرگوں کو برا بھلا کہنے سے بھی گریز نہیں کریں گی۔ ان حالات یا خدشات کا عملی مظاہرہ ہم موجودہ عہد میں بعینہٖ دیکھ سکتے ہیں۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں کی توپوں کا رخ ایک طرف تو جدید فیشن کی طرف تھا تو دوسری طرف وہ جدید تعلیم کے بھی سخت مخالف تھے اس ضمن میں انھوں نے سر سید اور ان کی چندہ اگانے کی مہم کو بھی خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ مغربی اقوام کی مادر پدر آزاد ثقافت نے جہاں برِصغیر کی تہذیب پر اپنے نقوش ثبت کیے وہیں مذہب بھی اس کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر طبقہ مغرب کی تقلید میں مذہب سے دور ہوتا چلا گیا۔ مذہب کی پیروی کرنے والوں کو قدامت پسند اور دقیانوسی کہا جانے لگا۔ مغرب کی تقلید کو جدت پسندی اور روشن خیالی سے تعبیر کیا گیا۔ اس صورتِ حال کو نظم ''مذہب کا سفر در وطن'' مطبوعہ اودھ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

شور و غوغا کیا ہے یہ مذہب گیا، مذہب گیا
کیوں گیا؟ کیوں کر گیا؟ کس جا گیا؟ اور کب گیا؟
گر گیا لندن کو، وہ تو معدنِ تہذیب ہے
سمجھو یوں برجِ شرف میں دین کا کوکب گیا

جا رہے جدے کو مرکب ہیں ہزاروں کیا حرج
اِکّا دُکّا گر کوئی یورپ کو بھی مرکب گیا(۱۹)

اودھ پنچ میں لکھنے والے کم وبیش تمام شعرا نے مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کو بھی بطور ہتھیار استعمال کیا ہے۔خاص طور پر مذہب سے دوری اور مغربی افکار کی تقلید کو تو شدت سے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔درجِ بالا اشعار میں مذہب کو لندن بھیجے جانے میں بھی یہی طنز کارفرما ہے،اسی طرح یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

ڈر کچھ نہیں بغاوتِ شرعِ مبین سے
کیا کام اہلِ فسق کو مذہب سے، دین سے؟(۲۰)

اودھ پنچ نے اردو ادب میں جہاں طنز ومزاح کی روایت کو مضبوط کیا وہیں لوگوں کے اذہان میں یہ فکر پیدا کرنے کی بھی کوشش کی کہ مغربی افکار کو اپنانے سے اپنی اخلاقیات وروایات پر منفی اثرات مرتب ہونے کا خدشہ ہے۔اور اگر کوئی قوم اپنی تہذیبی،ثقافتی،سماجی،معاشرتی،مذہبی اور اخلاقی روایات سے دور ہو جائے تو اس کا وجود شاید ہی باقی رہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> منشی سجاد حسین کے ''اودھ پنچ'' کی فائلیں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں برطانوی حکومت کے خلاف لب ہلانا بغاوت سمجھا جاتا تھا ان ادیبوں نے کیسی جرات اور بے باکی سے حکومت کی پالیسیوں اور لوٹ کھسوٹ کو طنز وتضحیک کا نشانہ بنایا۔کارٹونوں کے ذریعے مذاق اڑایا اور لوگوں کے دلوں میں نوآبادیاتی غلامی کے خلاف نفرت پیدا کی۔ (۲۱)

اودھ پنچ کے دستیاب شماروں (جن کی تعداد سو کے قریب پہنچتی ہے) کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس میں شامل اکثر تحریروں میں جدید تعلیم وتہذیب جس کی بنیاد مغربی افکار پر ہے،کی شدت سے مخالفت پائی جاتی ہے جس کی بہت ساری وجوہات ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ہم نے جن چیدہ چیدہ وجوہ پر بات کی اُن میں خاص طور پر مغربی تعلیم،فیشن،مذہب سے دوری،تعلیمِ نسواں اور مادر پدر آزادی کی مخالفت وغیرہ شامل ہیں۔ پس منظر میں یقیناً یہ وجہ رہی ہوگی کہ مغربی اقدار میں بزرگوں کی عزت وتکریم کا وہ معیار نہیں جس کا اسلام درس دیتا ہے۔پھر مذہبی نظریات میں بہت سے اختلافات ہونے کے باوجود ماں باپ کی اور بزرگوں کے چرن چھو کر ان کی توقیر کرنے جیسے عوامل ہندو دھرم کو بھی مغربی اقوام سے ممتاز کرتے ہیں،جبکہ مغربی ممالک میں ایسی کوئی روایت نظر نہیں آتی۔وہاں کی اخلاقی اقدار کی بنیاد مادیت پرستی ہے،اسی لیے ان کی پیروی کرنے والوں پر شعرا وادبا نے شدت سے طعن وملامت کی۔ان کے نزدیک خواتین کو امورِ خانہ داری میں مہارت حاصل کرنی چاہیے کیوں کہ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے وہ پڑھنے لکھنے میں کامیاب تو ہو جائیں گی لیکن امورِ خانہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گی جس کا براہِ راست اثر خاندان اور بچوں پر پڑے گا۔دوسرے یہ کہ اس

زمانے کے عوام کا یہ رویہ بن گیا تھا کہ لباس، پوشاک، بول چال، اورفکر وعمل سے جو شخص جتنا زیادہ مغربیت پسند ہوتا اتنا ہی قابلِ تکریم سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ ان کی فہمائش کے لیے کوئی مناسب ذریعۂ اظہار اختیار کیا جائے۔ سواودھ پنچ کو اپنے افکار کے اظہار کے لیے مناسب پلیٹ فارم سمجھتے ہوئے اپنی تحریروں کے ذریعے ادبا وشعرا نے یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تعلیم کے بعد ایک اور اہم مسئلہ مذہب کے حوالے سے تھا۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ برِصغیر میں اکثر مسائل مذہب کی بنیاد پر پیدا ہوئے۔ نوآبادیاتی عہد میں مغربی اقوام نے بھی برِصغیر میں مذہب کا رڈ کھیلا اور یہاں کے مقامی باشندوں میں تفرقہ ڈالا اور ہندو مسلم دونوں اقوام جو صدیوں سے ایک ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر رہتی آئی تھیں ایک دوسرے کی مخالف ہو گئیں۔ اس کے متوازی برِصغیر کے مقامی باشندوں اور بالخصوص طبقۂ امرا نے مغربی وضع اور مغربی افکار کو اپنانے میں فخر محسوس کیا اور جو لوگ مذہب کی پیروی کرتے تھے ان کو قنوطی اور قدامت پسند کہہ کر اُن کا مذاق اڑایا۔ اودھ پنچ میں ایسے لوگوں کو بھی نشانے پر رکھا گیا جو اپنے ہم وطنوں کو کم تر اور حقیر جانتے اور مغربی وضع قطع میں ڈھال کر خود کو اُن سے افضل گردانتے تھے۔

من حیث المجموع اودھ پنچ میں شعرا نے مختلف پیرایوں میں، خواہ وہ مذہب سے دوری کی شکل میں ہو یا جدید تعلیم کی صورت میں، لباس کی صورت میں ہو یا طرزِ بودوباش کی صورت میں، غرض ہر شعبۂ زندگی میں مغربی تہذیب کے اثرات کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ ہندوستانی عوام مغربیت پسندی کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنی اساسی اقدار کو فراموش نہ کردیں اور مغربی تہذیب کی چمک دمک میں کھو کر اپنی اصل سے دور نہ ہو جائیں۔

☆☆☆☆☆

# حوالے

(۱) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (پیش لفظ)۔لاہور:سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۳،ص۔۶

(۲) اکبرالہٰ آبادی۔شدتِ تہذیب (فرد)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:مطبعِ عام،مطبوعہ ۱۳ستمبر،۱۹۰۶ء،جلد نمبر ۲۰،شمارہ نمبر ۳۳۶،ص۔۳

(۳) محمود گیلانی کوٹلوی۔تہذیبِ نو کی کرشمہ سازیاں (رباعیات)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس، مطبوعہ ۲۳دسمبر،۱۹۲۹ء،جلد ۱۴،شمارہ ۴۵،ص۔۵

(۴) ندیم۔وائسرائے کا اعلان (رباعی)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۱۸نومبر،۱۹۲۹ء جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۴۰،ص۔۳

(۵) خفاش کرمانی۔الخفاشیات (نظم)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنؤ:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۲۶ اگست ۱۹۲۹ء،جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۳۲،ص۔۳

(۶) خفاش کرمانی۔الخفاشیات (غزل)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنؤ:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۱۲اگست،۱۹۲۹ء،جلد نمبر ۱۴، شمارہ ۳۰،ص۔۳

(۷) بی۔اے مجذوب،مشمولہ اودھ پنچ لکھنؤ:مطبوعہ ۵ اگست ۱۹۲۹ء،ص۔۳

(۸) اصغر شاہ پوری۔نیچری فیشن (نظم)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۲۰دسمبر،۱۹۰۶ء،جلد نمبر ندارد،شمارہ نمبر ندارد،ص۔۱۱

(۹) ندیم۔اختلافِ آرا (رباعی)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۷جنوری،۱۹۲۹ء،جلد نمبر ۱۴،شمارہ نمبر ۱،ص۔۵

(۱۰) ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی۔"اکبر الہٰ آبادی، نوآبادیاتی نظام اور عہدِ حاضر"مشمولہ:فکر و تحقیق اکبر الہ آبادی نمبر"،مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو،نئی دہلی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء،شمارہ نمبر ۱،ص۔۱۹،۲۰

(۱۱) غلط العام۔ہر وَلَہٗ قلم (نظم)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۱۸ اگست،۱۹۲۸ء،جلد نمبر ۱۳،شمارہ نمبر ۳۰،ص۔۱۰

(۱۲) فریدوں مرزا مجروح۔زخم ہائے تازہ وپارینہ۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۱۹تا۲۶مئی ۱۹۲۸ء، جلد نمبر ۱۳،شمارہ نمبر ۱۹،ص۔۳

(۱۳) ناصح۔غزل۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۴فروری،۱۹۲۸ء،جلد نمبر ۱۳،شمارہ نمبر ۵،ص۔۶

(۱۴) ناصح۔غزل۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۴فروری،۱۹۲۸ء،جلد نمبر ۱۳،شمارہ نمبر ۵،ص۔۶

(۱۵) محمد عبداللہ فضا حیدرآبادی۔خطاب شاعر لطیف ظریف به ذاتِ شریف ۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۱۱فروری ۱۹۲۸ء،ص۔۳

(۱۶) میر مضحک ۔تعلیمِ ولایت (رباعی)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ یکم نومبر ۱۹۰۶ء،جلد نمبر ندارد، شمارہ نمبر ندارد،ص۔۱

(۱۷) ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی ۔''اکبر الہٰ آبادی، نو آبادیاتی نظام اور عہدِ حاضر ''مشمولہ:فکر وتحقیق اکبر الہٰ آبادی نمبر''،مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو،نئی دہلی،جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء،شمارہ نمبر ا،ص۔۱۹،۲۰

(۱۸) اصغر شاہ پوری۔حدِ تہذیب (نظم)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۱۳دسمبر ۱۹۰۶ء،جلد نمبر ندارد، شمارہ نمبر ۵،ص۔۱

(۱۹) میرلن ترانی۔مذہب کا سفر در وطن (نظم)۔ مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۱۵دسمبر ۱۹۰۴ء،جلد نمبر ۲۸،شمارہ نمبر ۵۰،ص۔ن

(۲۰) نورالحسن ذہین کرتپوری۔تضمین پر تضمین (نظم)۔مشمولہ اودھ پنچ لکھنو:ممتاز المطابع پریس،مطبوعہ ۱۸دسمبر ۱۹۰۲ء،جلد نمبر ۲۶،شمارہ نمبر ۵۱،ص۔۵

(۲۱) ڈاکٹر قمر رئیس۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات: ایک جائزہ۔ دہلی:اردو اکادمی،۱۹۸۶ء،ص،۱۷،۱۸